© rasailojaraid.com

سرسید اور خرد افروزی کی تحریک

مسلم شمیم

سرسید اور علی گڑھ تحریک مترادفات (Synonymous) کی حیثیت رکھتے ہیں اور دونوں کا تصور ایک دوسرے سے جُڑا ہوا ہے۔ سرسید کی شخصیت کی کثیر الجہتی اور جامعیت اور اُن کے کارناموں پر گفتگو کرنا آج کا نہ تو موضوع ہے اور نہ میرا منصب و بساط۔ سرسید کی شخصیت کا ہر پہلو اور اُن کی خدمات اور کارناموں کا ہر شعبہ تاریخ ساز اور رجحان ساز کہلانے کا استحقاق رکھتا ہے۔ عالمی مسلم معاشرے پر عمومی طور پر اور جنوبی ایشیا یعنی برعظیم کے مسلم معاشرے پر خصوصی طور پر اُن کے عظیم احسانات ناقابلِ فراموش بھی ہیں اور غیر معمولی تاریخی اہمیت اور افادیت کے حامل بھی۔ اختصار کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ آج کا برعظیم کا مسلم معاشرہ جن ارتقائی مراحل سے گزرا ہے اور آج ہم جس حد تک عہدِ جدید میں جی رہے ہیں اور علم و شعور کی جو بھی متاع اور پونجی ہمارے پاس ہے اِس کا بڑا حصہ سرسید کی دین ہے۔ سرسید کی علی گڑھ کی تحریک اور اُن کی فکری رہنمائی اگر کلیتًا ناکام ہوگئی ہوتی تو برعظیم کا مسلم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معاشرہ افغانستان سے بدتر پس ماندگی سے دوچار رہتا۔ واضح رہے کہ تحریکِ پاکستان سرسید کی تحریک کا تسلسل اور قیامِ پاکستان اُس کا منطقی نتیجہ تھا۔

اِن ابتدائی کلمات اور جملہ ہائے معترضہ کے بعد میں اپنے آج کے موضوع کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں مگر سرسید کی خرد افروزی کی تحریک کی تفہیم کے لیے ضروری بلکہ میرے نزدیک ناگزیر ہے کہ اُن کے ذاتی کوائف کے علاوہ اُن کے عہد کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیا جائے اور تاریخی پس منظر اور پیش منظر کو سامنے رکھا جائے۔

خرد افروزی سے میری مراد حریتِ فکر، روشن خیالی، تعقّل پسندی، رواداری اور سائنسی فکر ہے یعنی میرے نزدیک سرسید پہلے عظیم مسلم صاحبِ خرد، دانشور اور مفکر و ادیب تھے جنہوں نے حریتِ فکر کا پرچم بہ بانگِ دہل بلند کیا اور حریفوں سے کفر و الحاد کے فتووں کی سوغات پائی۔ اُنہوں نے عقل کو اپنا رہبر و رہنما بنایا اور صدیوں پرانے روایتی عقائد اور رسم و رواج کو علومِ جدیدہ کی کسوٹی پر پرکھا۔ انہوں نے منقولات پر معقولات کو، روایت پر درایت کو، کورانہ تقلید پر اجتہاد کو ترجیح دی اور اندھا دھند اسلاف پرستی کے خلاف آواز بلند کی اور جہاد کیا۔ اُنہوں نے حریتِ فکر یعنی انکار کی جرأت کا مظاہرہ بڑی پامردی سے کیا اور تاریخ کی چند نامور ترین شخصیات کی فہرست میں اپنا نام نمایاں طور پر شامل کرانے میں کامیابی حاصل کی۔ اِس ضمن میں سبطِ حسن کی تحریر کا ایک اقتباس نہایت برمحل ہے اور قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث:

> ''اقرار پسند معاشرے کا اسمِ اعظم ایک چھوٹا سا سہ حرفی لفظ 'ہاں' ہے۔ اس لفظ میں علی بابا کے کُھل جا سم سم سے بھی کہیں زیادہ تاثیر پوشیدہ ہے۔ جن لوگوں کو 'ہاں' کہنے کا ہنر آتا ہے اُن پر دنیا و عاقبت کی نعمتوں کے تمام دروازے کُھل جاتے ہیں، اقتدار اُن کو پہلو میں بٹھاتا ہے، اختیار اُن کے قدم چومتا ہے، عمال و عمائدین اُن کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

> دوستی پر فخر کرتے ہیں، علمائے دین اُن کے بازو پر امام ضامن باندھتے ہیں، اُن کا سنگین سے سنگین جرم بھی قانون کی پُرسش سے بَری ہوتا ہے اور اُن کی ہر بدی کو نیکی سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن ہر اقرار پسند معاشرے میں ایسے دیوانے بھی ہوئے ہیں جنھوں نے بُرائی کو بھلائی کہنے سے ہمیشہ انکار کیا اور سزا پائی۔ سقراط نے 'نہیں' کہا اور مصلوب ہوئے، ابوذر غفاری نے 'نہیں' کہا اور شہید ہوئے، امام ابوحنیفہ نے 'نہیں' کہا اور بارہ سال قید رہ کر قید خانے ہی میں وفات پائی، برونو اور جان ہوس نے 'نہیں' کہا اور آگ میں جلائے گئے، تھاموس مور نے 'نہیں' کہا اور قتل ہوا، سرمد نے 'نہیں' کہا اور سر قلم کروایا، حسن و وفا کی پیکر طاہرہ قرۃ العین نے 'نہیں' کہا اور ماری گئی اور پھانسی پائی، جولیس فیوچک اور گیبریل پری نے 'نہیں' کہا اور قتل ہوئے، حسن ناصر نے 'نہیں' کہا اور قلعۂ لاہور میں اس شان سے قربان ہوئے کہ نہ کہیں جنازہ اُٹھا نہ کہیں مزار بنا، چلی کے صدر الندے نے 'نہیں' کہا اور زندگی جمہوری قدروں پر نچھاور کردی۔''

سرسید کا ضمیر بھی انکار کی سچائیوں سے اُٹھا تھا۔ وہ اُن غیر معمولی شخصیتوں میں سے تھے جو اپنے عہد کے صدق و کذب کو پہچان لیتی ہیں اور اِس آگہی کے بعد دنیا کی کوئی طاقت، کوئی آزمائش اُن کو جھوٹ کے ساتھ سمجھوتا کرنے یا سچ سے منہ موڑ لینے پر آمادہ نہیں کرسکتی۔ سرسید تمام عمر 'ناحق' کے جواب میں 'نہیں' کہتے رہے اور 'حق' کی برملا تلقین کرتے رہے، اپنے Commitment اور Conviction سے سرِمو انحراف کا راستہ نہیں اپنایا۔ اُنھوں نے جراٴتِ انکار اور حریتِ فکر کا علم بلند رکھا اور رجعت پرست مذہبی حلقوں کی شدید ترین مخالفت اور کفر و الحاد کے فتووں اور نیچری ہونے کے الزامات کی کوئی پروانہ کی اور اس طرح زندۂ جاوید ہونے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

والوں کی فہرست میں اپنا نام درج اور محفوظ کرالیا۔

سرسید ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۳۹ء میں آگرہ کمشنری میں نائب منشی کے عہدے پر اُن کی تقرری ہوئی۔ ۱۸۴۱ء میں مین پوری میں منصف کے منصب پر فائز ہوئے۔ ۱۸۴۲ء میں مغلیہ دربار سے جواد الدولہ عارف جنگ کا خطاب عطا ہوا۔ ۱۸۴۷ء میں 'آثار الصنادید' کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔ ۱۸۵۵ء میں بجنور میں صدرِ امین مقرر ہوئے۔ ۱۸۵۵ء میں ''آئینِ اکبری'' کی تصحیح اور اُس کی اشاعت عمل میں آئی۔ ۱۸۵۸ء میں مرادآباد میں صدر الصدور مقرر ہوئے۔ ۱۸۵۸ء ''تاریخِ سرکشیِ ضلع بجنور'' شائع کی۔ ۱۸۵۹ء میں بغاوت کرنے والوں کی جائیداد کی ضبطی کے خلاف اپیل سننے والے کمیشن کے رکن نامزد ہوئے۔ ۱۸۵۹ء میں ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' کی اشاعت ہوئی۔ ۱۸۶۰ء میں کتاب ''لائل محمڈنز آف انڈیا'' شائع ہوئی۔ ۱۸۶۴ء میں غازی پور میں ایک مدرسے کی بنیاد ڈالی اور سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جو بعد میں علی گڑھ میں منتقل ہوگئی۔ ۱۸۶۴ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے اعزازی رکن منتخب ہوئے۔ ۱۸۶۶ء میں برٹش انڈیا ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۸۶۶ء میں ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' کا اجرا ہوا۔ ۱۸۶۹ء میں انگلستان گئے اور اِسی سال سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب پایا۔ ۱۸۷۰ء میں لندن سے ہندوستان واپسی ہوئی۔ ۱۸۷۰ء میں ''تہذیب الاخلاق'' کا اجرا کیا۔ ۱۸۷۵ء میں ایم اے او کالج کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۸۷۶ء میں ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔ ۱۸۷۶ء میں تفسیر القرآن لکھنے کی ابتدا کی۔ ۱۸۷۸ء میں وائسرائے کونسل کے رکن نامزد ہوئے۔ ۱۸۸۰ء میں وائسرائے کونسل کے دوبارہ رکن نامزد ہوئے۔ ۱۸۸۶ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔ ۱۸۸۸ء میں کے سی ایس آئی کا خطاب ملا۔ ۱۸۸۹ء میں ایڈنبرا یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دی اور ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو علی گڑھ میں وفات پائی۔ مذکورہ کوائف سے سرسید احمد خاں کی عملی زندگی کے اہم واقعات کا بخوبی علم ہو جاتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ذاتی کوائف کے بعد اُس عہدِ تاریخ کا مختصراً جائزہ پیش کر رہا ہوں جس عہد میں سرسید نے آنکھ کھولی اور فکر وشعور کی منزلیں اور مراحل طے کیے۔ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۸۹۸ء میں ۸۱ برس کی عمرِ طبعی پا کر اُن کا انتقال ہوا تھا۔ گویا ۱۹ویں صدی کا بیشتر حصہ پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ برعظیم کی سیاسی صورتِ حال یہ تھی کہ کرۂ ارض کی ایک عظیم سلطنت یعنی سلطنتِ مغلیہ کا زوال ۱۷۰۷ء یعنی اورنگ زیب کی وفات کے ساتھ شروع ہو گیا تھا اور سو برس کے دورانیے میں سلطنتِ مغلیہ کی شکست و ریخت تقریباً آخری مراحل میں داخل ہو چکی تھی جو ۱۸۵۷ء میں رسمی طور پر تاریخ کا حصہ بن گئی۔ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے اسباب پر گفتگو کرنا میرے موضوع کے دائرے میں شامل نہیں ہے پھر بھی اِتنا ضرور عرض کرنا چاہوں گا کہ اِس ضمن میں بہت کم لوگ اُن عوامل پر توجہ دے پاتے ہیں جن کی حیثیت کلیدی ہے جن کی طرف جناب سبطِ حسن نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''پاکستان میں تہذیب کا ارتقا'' کے آٹھویں باب ''مغلیہ تہذیب۔ ہم عصر تہذیب کے آئینے میں'' کے ابتدائیے میں توجہ مبذول کرائی اور جو نہایت اہم اور فکر انگیز ہے لہٰذا وہ اقتباس نذرِ قارئین ہے:

> ''ہمیں مغلیہ تہذیب کے زوال کے بنیادی اسباب اُس خود کفیل معاشرے میں تلاش کرنا چاہئیں جس کو ایجاد و اختراع کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی تھی، اُن آلات و اوزار میں تلاش کرنا چاہئیں جن میں صدیوں سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی، اُس جاگیری نظام میں تلاش کرنا چاہئیں جس میں مزید ترقی کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی، اُس مطلق العنان شخصی حکومت میں تلاش کرنا چاہئیں جس میں ملک اور قوم کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے تمام اختیارات بادشاہ اور امرا کو حاصل تھے اور رعایا کو کسی سطح پر بھی نمائندگی کا حق نہ تھا اور نہ وہ امورِ سلطنت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں شرکت یا مداخلت کرسکتی تھی اور اُن اظہار و عقائد میں تلاش کرنا چاہئیں جن کے باعث پڑھا لکھا طبقہ بھی کنویں کا مینڈک بن گیا تھا اور اُس کی تلاش و جستجو کی صلاحیت، کیوں اور کیسے کہنے کی صلاحیت سلب ہوچکی تھی۔ انگریز نہ آتے تو ممکن ہے کہ ایشیا کا یہ مردِ بیمار چین کی مانند سو دو سو سال اور گھسیٹ لے جاتا مگر اُس بوڑھے کی طرح جس کے ہاتھوں میں جنبش کی سکت نہ ہو مگر آنکھوں میں دم ہو، جو خود کچھ نہ کرسکتا ہو مگر جس میں دید کی ہوس باقی ہو۔''

غرض یہ کہ ایسٹ انڈیا یعنی برطانوی نو آبادیاتی نظام یعنی صنعتی انقلاب کے بطن سے پیدا ہونے والے سرمایہ دارانہ نظام نے مغلیہ سلطنت کو، جس کی بنیاد جاگیردارانہ نظام پر استوار تھی، مرحلہ وار انہدام سے دوچار کیا۔ ۱۷۵۷ء کی جنگِ پلاسی کی شکست کو میر جعفر کی غداری سے منسوب کرنے والے ۱۷۶۵ء میں بکسر کی جنگ کو فراموش کرجاتے ہیں جہاں اُس وقت کے ہندوستان کے تین اہم ترین مراکزِ حکومت یعنی اودھ، دہلی اور بنگال کی فوجوں کو انگریزوں کے ہاتھوں فیصلہ کُن شکست کا سامنا ہوا تھا۔ بعدازاں ٹیپو سلطان کی شکست ۱۷۹۹ء کو میر صادق کی غداری کے کھاتے میں ڈال کر ۱۸۵۷ء میں ہونے والی معرکہ آرائی کو جس میں پورے ہندوستان کی چھوٹی بڑی حکومتوں اور عوامی اُبھار کو اجتماعی شکستِ فاش کا سامنا کرنا پڑا، بھول جاتے ہیں۔ میرا اِس ضمن میں یہ کہنا ہے کہ دراصل یہ فتح و شکست تاریخ کی دین تھی۔ جاگیردارانہ نظام جو اپنی طبعی عمر پوری کرچکا تھا اُس میں سماج کو دینے کے لئے اُسے اور آگے لے چلنے کی کوئی صلاحیت اور توانائی باقی نہیں رہی تھی۔ اس کے برعکس یورپ میں پندرھویں صدی سے Renaissance یعنی نشاۃ الثانیہ کے سائے میں رونما ہونے والے انقلابات اور تبدیلیاں دراصل تاریخِ عالم پر اثر انداز ہونے کا باعث بنیں۔ صنعتی انقلاب نے فکر و شعور کو نئے امکانات سے روشناس کیا اور آلات و اوزارِ پیداوار کی انقلابی پیش رفت نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک ایسا توانا نظام پیدا کیا جس کے سامنے جاگیردارانہ نظام کی فرسودگی کا تاش کے پتوں کی طرح بکھر جانا قدرتی عمل تھا۔ سو میرے نزدیک پلاسی، بکسر، سرنگا پٹم اور ۱۸۵۷ء کی معرکہ آرائیوں میں دراصل ترقی کے ہاتھوں پس ماندگی کو شکست ہوئی تھی اور تاریخ میں ہمیشہ ایسا ہوتا رہا ہے۔

یہ وہ تاریخی تناظر ہے جس میں سرسید کی خدمات، کارناموں اور اُن کے فکر و شعور کے ارتقائی سفر کو سمجھنا ہوگا۔ اس کا اعتراف کرنا کہ یہ تاریخی شعور، جو خرد افروزی پر استوار تھا سرسید کو مرزا غالب سے ملا تھا، سرسید کی عظمت کو ٹھیس پہنچانا نہیں ہے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء تک سرسید کا جہانِ فکر و نظر دوسرے اہلِ دانش سے مختلف نہ تھا، چنانچہ ۱۸۵۴ء میں 'آثار الصنادید' کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنا اور ۱۸۵۵ء میں 'آئینِ اکبری' کی تدوین و تصحیح اور اُس کی اشاعت اُن کے ماضی پرستارانہ Mindset کی غماز ہے۔ مرزا غالب نے اُن کی تصحیح کردہ 'آئینِ اکبری' کے حوالے سے جو منظوم تقریظ لکھی اُس کا مطالعہ قارئین کو مرزا غالب کی عظمتِ فکر و نظر اور مستقبل شناسی کا قائل کر دیتا ہے۔ تقریظ کی تمہید میں غالب، سرسید احمد خاں کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک ''دیدۂ بینا'' نے کہنگی کو نیا لباس پہنایا ہے لیکن ''آئینِ اکبری'' کی تصحیح اُن کی 'ہمتِ والا' کے لئے ''باعثِ ننگ و عار'' ہے۔ اُنہوں نے اس مشغلے سے اپنا دِل بے شک خوش کیا مگر میں ''آئینِ ریا'' کا دشمن ہوں لہٰذا اُن کے کام پر آفریں نہیں کہہ سکتا کیوں کہ میں تخلیق کا جویا ہوں۔

اس منظوم تقریظ کا نثری ترجمہ ملاحظہ ہو:

> ''بقولِ غالب صاحبانِ انگلستان کو اور اُن کے شیوہ و انداز کو دیکھو۔ اُنہوں نے کیسے کیسے آئین وضع کیے ہیں اور ایسے آئین جس کو کسی نے پہلے کبھی نہ دیکھا یہاں لائے ہیں۔ اُن سے ہنرمندوں نے ہنر کے اصول سیکھے ہیں اور اپنے اجداد سے آگے نکل گئے ہیں۔ آئین پر عمل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنا اِس قوم کا حق ہے، کسی اور کو ملک کا انتظام اس سے بہتر چلانا نہیں آتا۔ اُنہوں نے عدل اور دانائی کو ملا دیا ہے اور ہند کو سو گنا ملکِ آئین بنا دیا ہے۔ لوگ پتھر سے چنگاری پیدا کرتے ہیں مگر یہ ایسے ہنر مند ہیں کہ تنکے سے آگ نکالتے ہیں، اُنہوں نے پانی پر نہ جانے کیا جادو کر دیا ہے کہ دھواں کشتی کو پانی ہانکتا ہے، بھاپ کبھی جہاز کو سمندر میں لے جاتی ہے اور کبھی چیزوں کو بلندی سے زمین پر لے آتی ہے۔ بھاپ کی قوت سے کشتی رفتار پکڑتی ہے اور اُس کے سامنے ہوا اور پانی کی لہریں دونوں بے بس ہو جاتی ہیں۔ یہ لوگ ساز سے دُھن نکالتے ہیں اور حروف کو پرندوں کی پرواز عطا کرتے ہیں۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ یہ عقل مند لوگ لفظوں کا پیغام لمحوں میں سو کوس تک پہنچا دیتے ہیں، ہوا یعنی گیس کو اِس طرح آگ دِکھاتے ہیں کہ ہوا انگارے کی طرح دہکنے لگتی ہے یعنی گیس کی روشنی۔ لندن شہر پر نظر ڈالو جو رات کو بلا چراغ کے جگمگاتا رہتا ہے۔ ہوشیار آدمیوں کے کاروبار کو دیکھو ایک آئین میں سیکڑوں آئین کی کارفرمائی دیکھو۔ اس آئین کے آگے دوسرے آئین پرانی جنتری کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اے میرے بیدار مغز عاقل! کیا تمہاری کتاب میں ایسی دانائی کی باتیں ہیں؟ اگر کسی کو موتیوں کا خزانہ دکھائی دے تو وہ کھلیان میں سے ایک بالی کیوں چنے؟ فیض کے سرچشمے کو کنجوس مت جانو! خرمے کے درخت سے سورج رسیلے پھل ٹپکاتا ہے۔ مردہ پروری یعنی مُردہ پرستی کوئی اچھا مشغلہ نہیں۔ تم خود کہو! کیا یہ سب باتیں ہی باتیں نہیں ہیں؟

مرزا غالب (۱۷۹۷ء-۱۸۶۹ء) اُن صاحبِ بصیرت و بصارت ہستیوں میں سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھے جن کی نگاہیں موت کے ملبے میں زندگی کے اُبھرتے ہوئے آثار دیکھ لیتی ہیں۔ وہ بقولِ خود اُن ''آزاووں'' میں تھے جن کو ماضی کے مٹنے کا غم بیش از یک نفس نہیں ہوتا کیوں کہ ''برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم''۔ کلکتہ کے دو سال کے قیام کے دوران اُن کو اپنے مغربی تہذیب و تمدن کے حوالے سے خیال کو تقویت پہنچی اور اُن کا یہ خیال یقین میں تبدیل ہوا کہ مشرق کا معاشرتی نظام دم توڑ چکا ہے اور انگریز جو نظام اپنے ساتھ لائے ہیں وہ بڑا توانا اور جاندار ہے۔ اٹھارھویں صدی میں سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد ملک میں طوائف الملوکی، لاقانونیت اور افراتفری پھیلی، اُس کے پیشِ نظر مرزا غالب برطانیہ کے نافذ کردہ آئینِ نو کی طرف داری کرنے میں یقیناً حق بجانب تھے۔ اِس نئے آئین کے آگے ''آئینِ اکبری'' کی حیثیت واقعتاً پرانی جنتری سے زیادہ نہ تھی۔ سید صاحب کو وقتی طور پر غالب کی تنقید پسند نہیں آئی لہٰذا مذکورہ تقریظ کو کتاب میں اُنہوں نے شامل نہیں کیا کیوں کہ انگریزوں سے اپنی قربت اور وفاداری کے باوجود اُن کے نظامِ فکر و شعور میں روایت پسندی اور قدامت پسندی کی عملداری قائم تھی۔ مگر وہ زیادہ عرصے اِس دائرے میں مقید نہیں رہے۔ ۱۸۶۳ء میں اُنہوں نے غازی پور میں ایک سائنٹفک سوسائٹی بنائی تاکہ مغربی علوم کی کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا جائے۔ غازی پور میں سرسید احمد خان نے ایک سکول بھی کھولا جس میں انگریزی پڑھائی جاتی تھی، ۱۸۶۹ء میں وہ لندن گئے اور وہاں کے نظامِ تعلیم کا بالخصوص آکسفورڈ اور کیمبرج کے طریقِ تعلیم کا بغور مطالعہ کیا۔ لندن میں اُنہوں نے اپنے خیالات اور منصوبوں کی اشاعت کے لئے ایک رسالہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا اور ۱۸۷۰ء میں لندن سے واپس آتے ہی رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا۔ ۱۸۷۳ء میں اُنہوں نے مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کی خاطر ایک کالج قائم کرنے کی اسکیم شائع کی اور ۱۸۷۵ء میں ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ قائم ہوا جو بعد میں یونیورسٹی بنا اور جس کے حوالے سے علی گڑھ تحریک موسوم ہوئی اور جس نے ہندوستان کی مسلم آبادی کو فکر و نظر کے نئے زاویے دیے اور عہدِ نو کے تقاضوں سے ہم کنار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہونے کا Vision بخشا۔

سرسید کی علی گڑھ تحریک اُن کی قاموسی شخصیت کی طرح جتنی کثیر الجہت اور ہمہ گیر تھی اُتنی ہی متنازع بھی تھی اور سید صاحب کو مختلف محاذوں اور شعبوں میں جس مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اُس کی مثال مشکل سے ملے گی مگر جس مستقل مزاجی اور پامردی سے اُنہوں نے تمام مخالفتوں کا مقابلہ کیا وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ مذہبی اور سیاسی حلقوں نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اُن کے خلاف صف بندی کی، تنظیمیں قائم کیں، ادارے بنائے اور تحریکیں چلائیں۔ سید صاحب نے ہر محاذ پر بڑے اعتماد اور یقین کے ساتھ اپنی کارگزاری کا مظاہرہ کیا اور وقت کے ساتھ وہ ضمیرِ وقت کی آواز اور روحِ عصر کے ترجمان بنتے گئے اور بقولِ مجروح:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

سرسید کی خرد افروزی کی تحریک دراصل ایک ہمہ گیر نشاۃ* الثانیہ (Renaissance) کی تحریک کا ایک حصہ اور جزو کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ نشاۃ الثانیہ کی تحریک مسلم دنیا اور مسلم معاشرے میں پہلی تحریک تھی جو انیسویں صدی میں سرسید کی قیادت و سیادت میں شروع ہوئی۔ یہ مجموعی طور پر ایک ایسی بیداری کی تحریک تھی جس نے تمام معاشرے کے ہر شعبے کو متاثر کیا اور اُن میں تبدیلیوں کے لیے نئی راہیں کھولیں اور نئے امکانات کی نشاندہی کی۔ سرسید کی خرد افروزی کی تفہیم کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اُن فکری مغالطوں کو پیشِ نظر رکھا جائے جو صدیوں سے ہندی مسلم معاشرے میں عام طور پر عقائد کا درجہ رکھتے ہیں اور Mindset بن چکے ہیں۔ اِس باب میں ڈاکٹر محمد اشرف کی کتاب ''ہندوستانی مسلم سیاست پر ایک نظر'' (مطبوعہ ۱۹۶۳ء، نئی دہلی) کا پہلا باب زیرِ عنوان ''ہندوستانی مسلم سیاست کا پس منظر اور جاگیری عناصر کی رہنمائی'' بہت اہمیت اور معنویت کا حامل ہے لہٰذا مذکورہ باب کا ابتدائیہ نذرِ قارئین ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلم سیاست کے خصائص کو سمجھنے کے لیے اُس کا یہ نمایاں پہلو ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ تقریباً ایک ہزار برس تک ہندوستانی ذہن پر مسلم جاگیریت اور شہنشاہیت کی حکمرانی رہی ہے اور اُن کے سماجی، سیاسی اور مذہبی افکار پر اِسی جاگیریت اور کشور کشائی کی چھاپ نظر آتی ہے۔ یہ ہمارے سماج میں اِس طرح داخل ہوئی تھی کہ ہمارے سر پر ترک افغان یا مغل مطلق العنان بادشاہ جو غیر مسلم ہندوستانیوں پر یہی نہیں کہ راج کرتے تھے بلکہ مذہبی تحکّم کا مظاہرہ بھی ضروری سمجھتے تھے۔ اُن کے دائیں بائیں مذہبی عالموں اور امیروں کی صفیں تھیں، سامنے سپاہیوں کا ہجوم ہوتا تھا اور پیچھے پیچھے غلاموں اور حلقہ بگوش خادموں کے جمگھٹے نظر آتے تھے۔ صدیوں کی حکومت کے بعد یہ عقیدہ پختہ ہوگیا کہ مغل شہنشاہیت ابدالآباد تک دائم و قائم رہے گی۔ یہ صحیح ہے کہ مسلم عوام اور زناردار وں کی زندگی میں کوئی نمایاں فرق نہ تھا۔ دونوں قانونی لگان اور غیر قانونی محصولوں کے بوجھ سے دبے جاتے تھے مگر مسلمانوں کی تسکین کے لئے حکمرانانِ وقت نے بڑی بڑی مسجدیں اور اُن کے دل بہلانے کے لئے صوفیائے کرام نے خانقاہیں بنائی تھیں۔ دینیات پڑھنے والوں کو حکومت کی طرف سے وظیفے اور درس گاہوں کے معلمین کو مددِ معاش کے نام پر روزینے ملتے تھے تاکہ سب کے سب اُن شہنشاہوں اور امیروں کے حق میں دعائے خیر کریں اور اگر اِسی سرزمین پر یہ مطلق العنان لشکر کشی کریں تو اُسے جہاد فی سبیل اللہ سے تعبیر کرکے اُس کے لئے عام فضا سازگار بنائی جائے۔ علمائے اسلام اس لئے اور بھی قابلِ لحاظ تھے کہ انھوں نے اپنے فقہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے امارت کی بحث کا باب خارج کردیا تھا اور بادشاہ کو ظلِ الٰہی قرار دینے کے بعد انھوں نے اِس کے جواز میں تمام مذہبی استناد فراہم کرلیے تھے۔ علمائے اسلام نے ایک زمانے سے انسانیت کو مومن و کافر اور دنیا کو دارالاسلام اور دارالحرب میں تقسیم کردیا تھا یعنی کسی اسلامی مملکت میں صرف مسلمانوں کو شہریت کے حقوق حاصل تھے اور غیر مسلم صرف ذمی کی حیثیت رکھ سکتے تھے۔ اِس طرح جو علاقہ اسلامی حکومت سے خارج ہو یعنی جس پر اہلِ وطن قابض ہوں اُس پر علمائے اسلام کے نزدیک جہاد کرنا ایک قسم کا فرض تھا۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ علمائے اسلام کے نزدیک مسلمان ہندوستان میں صرف فاتح اور حکمران کی حیثیت سے زندہ رہ سکتے تھے چنانچہ جاگیری امارت کے اِس زعم میں علمائے اسلام نے مسلمانوں کی محکوم حیثیت کو ذہن میں رکھ کر شریعت کا کبھی کوئی قانون اور سماجی زندگی کا کوئی نظام مرتب نہیں کیا اور یہ کیفیت علمائے اسلام کی آج بھی ہے۔

ڈاکٹر محمد اشرف مرحوم کے خیالات اور آرا کا تجزیہ کیا جائے تو تاریخ کے بہت سے ابواب اور واقعات کے حوالے سے جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں انھیں یکسر رد کرنا پڑے گا اور سرسید کی فکر اور کارناموں کے حق میں نئے براہین اور دلائل میسر آئیں گے۔ سرسید کی تحریک کا کلیدی نکتہ مسلم عوام کو مذکورہ مغالطوں سے نکالنا اور اُن کا روایتی Mindset تبدیل کرنا تھا۔ ایسا کرنے کے لئے مغربی علوم میں سائنس سے بے گانگی اور دوری کا خاتمہ ضروری تھا۔ اس ہدف کے حصول کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں تھیں جن کا سرسید نے سامنا کیا اور بڑی حد تک کامیاب رہے۔ سرسید پر ایک بڑا الزام انگریزوں سے اُن کی قربت اور تاجِ برطانیہ سے وفاداری کے حوالے سے تھا۔ اِس ضمن میں نہ تو کسی معذرت خواہانہ اظہار و اعتراف کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ضرورت ہے اور نہ امرِ واقعہ سے کسی انکار کی حاجت۔ انگریزوں سے اُن کی قربت اور تاجِ برطانیہ سے اُن کی وفاداری سے نہ تو اُن کی نیک نیتی پر کوئی حرف آتا ہے اور نہ اُن کے موقف اور زاویۂ فکر پر۔ انگریز ہندوستان میں اپنے ساتھ ایک نیا عہد اور نیا نظامِ حیات اور سماجی ضابطہ لائے جس سے ہندوستان کی سرزمین اور معاشرہ اب تک نابلد اور ناآشنا تھا۔ مرزا غالب نے اِس نئی تہذیب اور تمدن کے خدوخال کا مشاہدہ کیا تھا اور اِس کا خیر مقدم کیا تھا، اِس میں کوئی غلطی اور فکر کی کوئی خرابی نہ تھی۔ سرسید نے اِس فکر اور زاویۂ نظر کو ایک تحریک کی حیثیت دی جو اُن کا رجحان ساز اور تاریخ ساز کارنامہ ہے۔ ہندوستان پر انگریزوں سے پہلے کہنے کو مسلمانوں کی ہزار سالہ حکومت رہی تھی۔ اس ہزار سالہ دورِ حکومت میں مسلم عوام کی زندگی کیسی تھی؟ سماج میں پائے جانے والے طبقات اور اُن کے درمیان تفریق و امتیاز کی خلیج کو سامنے رکھ کر دیکھیے تو یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آجائے گی کہ اس تمام دورِ حکومت میں مسلم عوام اِس طرح محکوم و رعیت Subject تھے جس طرح غیر مسلم عوام۔

واضح رہے کہ ہزار سالہ مسلم دورِ حکومت نے اِس ملک کو چند مسجدوں اور چند مقبروں کے علاوہ کچھ نہیں دیا۔ مغلیہ دورِ حکومت کے حوالے سے مسلمانوں میں بڑی خوش فہمیاں اور خوش گمانیاں ہیں کہ اس دور میں معاشرے نے بڑی ترقی کی اور عوام کی زندگی میں خوش حالی کا دور دورہ تھا اور علم و ادب کے فروغ کا بڑا چرچا پایا جاتا ہے۔ یہ سادہ لوح لوگ بھی بھول جاتے ہیں کہ جس ملک میں چھاپہ خانے نہ ہوں وہاں علم کے فروغ کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ عہدِ مغلیہ میں پورے ہندوستان میں کتنی جامعات قائم تھیں جہاں سے علم کا سورج طلوع ہوتا تھا؟ جواب صفر ہے۔ اکبر جیسے بیدار مغز اور روشن خیال شہنشاہ نے بھی ہندوستان میں چھاپہ خانے کو نہیں آنے دیا اور پرتگالی پادریوں کی پیش کش یہ کہہ کر ٹھکرا دی کہ اس سے ہاتھ سے لکھنے والوں یعنی کاتبوں کا روزگار متاثر ہوگا۔ یاد رہے کہ پرتگالی اپنے ساتھ چھاپہ خانہ لے کر آئے تھے۔ چھاپہ خانے کے سلسلے میں خلافتِ عثمانیہ کے زیرِ تسلط تمام ممالک میں یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صورت درپیش رہی۔ ترکی میں ۱۸۸۵ء میں چھاپہ خانہ لگانے کی اجازت اِس قید کے ساتھ دی گئی کہ چھاپہ خانوں میں اسلام اور مسلم عقائد ونظریات کی کتابیں نہ چھاپی جائیں گی۔ دراصل یہ اجازت وہاں آباد یہودیوں کو دی گئی تھی۔ سو مسلم دنیا کی دو عظیم سلطنتوں میں علم دوستی اور فروغِ علم کا یہ منظر نامہ کتنا افسوس ناک اور رجعت پرستانہ ہے، اس پر کوئی تبصرہ کرنا تضیعِ اوقات ہے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ تہذیب وتمدن اور سماجی ارتقا کا سفر علم کے سائے میں طے ہوتا ہے یعنی ارتقا کا سفر Knowledge Based رہا ہے۔ مسلم دنیا کی علم سے بے گانگی کو، جو گزشتہ کئی صدیوں پر محیط ہے، کیا کہا جائے؟

خامہ انگشت بہ دنداں کہ اِسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بہ گریباں کہ اِسے کیا کہیے

(غالب)

واضح رہے کہ آج بھی پوری مسلم دنیا میں جو ۵۹ ممالک پر مشتمل ہے کہیں بھی تحقیق وجستجو کے نہ تو ادارے ہیں اور نہ کوئی روایت ہے۔ یہ چھاپے خانے ہندوستان میں عہدِ مغلیہ کے خاتمے کے بعد انگریزی دورِ حکومت میں قائم ہوئے اور فروغِ علم کے دریچے وا ہوئے۔ اخبارات اور جریدوں کا کوئی تصور عہدِ مغلیہ کے خاتمے تک نہیں پایا جاتا تھا اور یہ سلسلہ انگریزی حکومت سے شروع ہوا۔ عہدِ مغلیہ میں منصب داری نظام رائج رہا جس کے تحت عوام Subject تھے، Citizen نہیں۔ منصب داری نظام میں حاکموں کے WHIMS قانون کا درجہ رکھتے تھے، کسی قانون کی حکومت اور بالادستی کا کوئی وجود نہ تھا۔ قانون کی حکمرانی کا آغاز بھی انگریزی دورِ حکومت سے ہوا ہے اور پہلا قانون ۱۸۳۴ء میں غلامی کا خاتمہ (Abolition of Slavery) برطانوی دورِ حکومت کا نافذ کردہ ہے۔ یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ جہاں قانون کی بالادستی نہ ہو وہاں حق (Right) کا تصور نہیں ہوتا جیسا کہ عہدِ مغلیہ تک عوام Subject تھے، Citizen نہیں لہٰذا عہدِ مغلیہ کو عہدِ آزادی کہنا اور برطانوی دورِ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حکومت کو عہدِ غلامی کہنا کہاں تک درست ہے، اِس پر غور کیا جانا چاہیے۔ میرے نزدیک تو انگریزی دورِ حکومت سے Rule of Law کا تصور وابستہ ہے اور ہمارا پورا نظامِ قانون جو آج بھی رائج ہے سب کا سب اُس ''دورِ غلامی'' کی دین ہے۔ میں تو برطانوی دورِ حکومت کے حوالے سے کوئی منفی رائے نہیں رکھتا بلکہ اُسے Blessing in Disguies سمجھتا ہوں۔ یہاں کارل مارکس کی برطانوی نو آبادیاتی نظام کے حوالے سے کڑی تنقید سے قطعِ نظر اُس کا تجزیہ ملاحظہ ہو:

> یہ صحیح ہے کہ ہندوستان میں سماجی انقلاب لانے کے سلسلے میں انگلستان کے محرکات ذلیل ترین تھے اور اُس کا اُن ذلیل مفادات کو ہندوستان پر ٹھونسنے کا طریقہ بھی بہت احمقانہ تھا لیکن سوال دراصل یہ نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ آیا ایشیا کی سماجی حالت میں ایک بنیادی انقلاب لائے بغیر انسانیت اپنی تقدیر کی تکمیل کر سکتی ہے؟ اگر نہیں کر سکتی تو انگلستان کے جرائم خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہوں، اُس نے بہرحال اِس انقلاب کو لانے میں تاریخ کے غیر شعوری آلۂ کار (Unconscious Tool of History) کا کام انجام دیا ہے۔ (Marx on India)

عہدِ مغلیہ نے چند مساجد اور چند مقبروں کے علاوہ ہندوستان کو اردو زبان عطا کی لیکن اردو زبان کے سلسلے میں بھی انگریزی دورِ حکومت کی خدمات، جن کا آغاز فورٹ ولیم کالج اور دہلی کالج سے ہوا، تاریخ کا حصہ ہیں۔

میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ میں سخن فہم نہیں ہوں مگر غالب کا طرف دار ضرور ہوں اور اس طرح سرسید کا بھی طرف دار ہوں اور بہ بانگِ دہل اُن کی انگریز دوستی کا حامی اور وکیل ہوں۔ جہاں تک انگریز دوستی اور تاجِ برطانیہ سے وفاداری کا سوال ہے تو اِس فہرست میں ہمارے سیاسی قائدین، علما اور اہلِ دانش کے ایسے نام شامل ہیں جن کا احترام بھی کیا جاتا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور جن کے کارنامے ملک و ملت کے لئے ناقابلِ فراموش ہیں۔ اِن میں علامہ سر محمد اقبال، قائداعظم محمد علی جناح، جسٹس سید امیر علی، سر آغا خان، شمس العلما مولانا شبلی نعمانی اور متعدد نامور شخصیات شامل ہیں لہٰذا سرسید کی انگریز دوستی کوئی سوالیہ نشان نہیں بنتی۔ سرسید کی انگریز دوستی کی صحیح تناظر میں تفہیم ضروری ہے۔ وہ اگر ایسا نہ کرتے تو اپنی تحریک اور اپنے مشن کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ امرِ واقعہ ہے کہ انگریزوں نے مسلمانوں سے سیاسی اقتدار چھینا تھا چنانچہ انگریزوں کا مسلم آبادی کی طرف سے بدظن رہنا اور مسلم اشرافیہ کو ۱۸۵۷ء کے غدر کے پس منظر میں انتقامی کارروائیوں کا ہدف بنانا ناقابلِ فہم نہیں ہونا چاہیے۔ دوسری جانب مسلم فرقے کی مجموعی طور پر انگریز دشمنی بھی منطقی بات تھی۔ سرسید نے دونوں محاذوں پر جو صبر آزما کارنامے انجام دیے ہیں وہ کسی غیر معمولی شخصیت ہی کا کام تھا۔ ایک طرف انگریزوں کو یہ باور کرانا کہ مسلم فرقے کو وہ اپنا ازلی دشمن نہ جانیں اور دوسری طرف اُن کو Winover کرنے کا مشورہ دیا۔ ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' میں سرسید نے انگریزوں کی اُن پالیسیوں کی نشاندہی کی جن کے نتیجے میں مسلمانوں میں بے چینی اور عدمِ اعتماد کے رجحانات پنپتے رہے، انگریزوں کو اُن کی غلطیوں سے آگاہ کیا اور ۱۸۵۷ء کے ظہور ہونے کے سلسلے میں اُن محرکات اور اسباب کا ایسا حقیقت پسندانہ جائزہ اور تجزیہ پیش کیا جس کے بڑے مثبت اثرات مرتب ہوئے۔ دوسری طرف مسلم آبادی کے انگریز دشمنی سے باز رہنے کے مشکل ترین مشن پر وہ گامزن ہوئے اور کامران رہے۔ اِس ضمن میں مذہبی حلقوں کی جانب سے جس قسم کی مخالفت بلکہ مخاصمت کا سامنا اُنھیں کرنا پڑا وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ مسلم علما کا ایک گروہ جہاد کا علم بلند کیے ہوئے تھا اور دوسرا گروہ کفر و الحاد کے حربوں سے لیس تھا۔ بہر حال سرسید اپنے مشن میں جزوی طور پر ہی سہی کامیاب رہے اور اِس کے نتیجے میں برعظیم کے مسلمان جس حد تک ممکن ہو سکا مذہبی تنگ نظری اور تعصّبات سے باہر نکل کر عصری تقاضوں اور عصری مسائل سے نبرد آزما ہونے کی اہلیت حاصل کر سکے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سرسید کی خرد افروزی کی تحریک براہِ راست سیکولرازم سے جڑی ہوئی ہے۔ سیکولرازم کے حوالے سے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کے معنی اور مفہوم کو کچھ حلقوں نے کفرو الحاد، لادینیت اور دہریت کا ہم معنی قرار دے کر معاشرے کو گمراہ کیا ہے۔ سیکولرازم حقیقی سیاسی تناظر میں ریاست کا مذہب کے بارے میں غیر جانب داری کا نظریہ ہے، یعنی مذہب فر رافراد کا ہوتا ہے ریاست کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ ریاست میں مختلف عقائد اور مذاہب کے لوگ رہتے ہیں جن کے ساتھ یکساں سلوک رکھنا اور سب کے حقوق کا یکساں تحفظ کرنا ریاست کے فرائضِ منصبی میں شامل ہے۔ ریاست کا قانون شہریوں کے درمیان امتیاز و تفریق کا نہیں بلکہ برابری کے اصول پر استوار ہوتا ہے۔ سیکولرازم کی اساس سائنسی فکر پر قائم ہے اور تعقّل پسندی اور خرد افروزی پر مبنی ہے۔ سرسید کی تحریک نہ تو کبھی فرقہ پرستی (Communalism) کی تحریک تھی اور نہ اسلامی ریاست کے قیام کی تحریک تھی۔ وہ مسلمانوں کے حقوق اور مستقبل کے تحفظ کے لئے فکر مند اور سرگرداں تھے چنانچہ غازی پور میں قائم ہونے والے اسکول کے دروازے ہندو اور مسلمان دونوں کے لئے یکساں کُھلے ہوئے تھے۔ یہی صورت علی گڑھ میں ایم۔اے۔او کالج کے ساتھ تھی۔ واضح رہے کہ سرسید مذہبِ اسلام کو صحیح تناظر میں رکھ کر دیکھتے تھے۔

سرسید کی توجہ کا مرکزی نقطہ سائنس اور سائنسی علوم کی مسلمانوں میں ترویج اور فروغ تھا، سائنٹفک سوسائٹی کا قیام اُن کی اِسی فکر اور زاویۂ نظر کا غماز تھا۔ مغرب کی جانب اُن کا جھکاؤ دراصل مغربی علوم کے لئے اُن کا عشق تھا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ مغربی دنیا نے سائنس اور سائنسی علوم وفنون کی روشنی میں ترقی کی منازل طے کی ہیں وہ یہی خواب پوری مسلم دنیا اور خاص طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے لئے دیکھتے تھے۔ وہ سائنس اور دیگر جدید مغربی علوم سے بے گانگی کو مسلمانوں کی پس ماندگی کا سرچشمہ جانتے تھے۔ وہ اسلام کے شیدائی تھے اور اُن کا مطالعۂ اسلام علم دوستی سے متصادم نہ تھا۔ وہ علم اور جستجو سے دُوری کو مسلم دنیا کی تنزلی کا کلیدی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سبب سمجھتے تھے۔ سرسید کے نظامِ فکر میں سائنس کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور اُن کی خرد افروزی کی تحریک اِسی کُل کا ایک جُزو تھی۔ ہمارا فرض ہے کہ ان کے نقطۂ نظر کا عقل وخرد کی روشنی میں تجزیہ کریں، ایسا کرنے سے ان کے اندر اسلام کا حامی اور محسنِ ملک وملت برآمد ہوگا۔

❁❁❁

© rasailojaraid.com